امریکا میں دہشت گردی

عالمی ضمیر کے لیے چند سوال

پروفیسر خورشید احمد

قرآن پاک نے انسانی جان کی حُرمت کو ایک ابدی اور عالمی اصول کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں انسانوں کے درمیان مکمل مساوات کا بھی حکم دیا ہے۔ مذہب، رنگ، نسل، قومیت، قبیلہ، برادری، رشتہ داری غرض کسی بنیاد پر بھی امتیازی سلوک کے لیے کوئی گنجایش نہیں چھوڑی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (المائدہ ۵:۳۲)

جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین پر فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

قانون کی حکمرانی کا نفاذ، قانون کے باب میں مکمل مساوات اور انسانوں کے درمیان عدل و انصاف کا قیام ہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر ایک پُرامن، صحت مند اور ترقی پذیر معاشرہ تعمیر ہوسکتا ہے۔ دولت کی فراوانی، سامانِ عیش و عشرت کی ارزانی اور سیاسی، معاشی اور عسکری قوت کی چمک دمک سب اپنی جگہ، لیکن جمہوریت اور ترقی کا اصل پیمانہ انسانیت کا احترام ہے، مال و متاع کی فراوانی نہیں ـــــــ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انسان کو قدم قدم پر اِدراک ہوتا ہے،

لیکن جس طرح صحت سے محرومی کے بعد ہی صحت کی قدر و منزلت کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح معصوم جانوں کے اتلاف اور دلوں کو ہلا دینے والے اندوہ ناک واقعات کے بعد ہی زندگی اور امن کی اہمیّت اور قیمت کا احساس ہوتا ہے اور انسان کو سوچنے پر بھی مجبُور کرتا ہے کہ ظلم، دہشت گردی اور سفاکیت کے ہاتھوں بہنے والے خون کے ہر قطرے سے جو آواز بلند ہو رہی ہے: بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ o (التکویر ۸۱:۹)، یعنی ''کس قصور میں مجھے ذبح کیا گیا ہے''۔ اس کا جواب بھی سوچ لے۔

امریکا میں دہشت گردی کا سنگین واقعہ

۱۴ دسمبر ۲۰۱۲ء کو امریکا کی ریاست کینیکٹی کٹ کے ایک چھوٹے مگر خوش حال شہر نیوٹاؤن کے سینڈی ہک ایلیمنٹری اسکول میں ایک ۲۰ سالہ نوجوان ایڈم لانز کے ہاتھوں ۲۰ کم سن بچوں اور بچیوں (۱۲ لڑکیاں اور ۸ لڑکے جن کی عمریں ۵ اور ۷ سال کے درمیان تھیں) اور ان کے چھے اساتذہ کا بہیمانہ قتل ایک ایسا واقعہ ہے جس نے امریکا ہی نہیں، پوری دنیا کے انسانوں کو اشک بار کر دیا ہے اور سوچنے سمجھنے والے تمام ہی افراد کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا کر دیا ہے کہ دنیا کے امیر ترین اور خوش حال ترین ملک میں، جو مغربی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھی شمار کیا جاتا ہے، ایسا اندوہ ناک واقعہ کیسے رُونما ہوگیا؟ ایسا کیوں ہے کہ یہ اور ایسے ہی دوسرے واقعات طاقت اور ترقی کے نشے میں مست انسانوں کی آنکھیں کھولنے کا ذریعہ نہیں بن پا رہے؟ ان واقعات کے آئینے میں آج کا انسان معاشرے اور تہذیب کے اصل بگاڑ، بیماری اور فساد کی حقیقی تصویر کیوں نہیں دیکھ رہا ہے؟ اور کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ انسان خود احتسابی کا راستہ اختیار کرے اور ان بنیادی اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرے جو بگاڑ کی اصل جڑ ہیں؟

اقبال نے بہت پہلے اس ضرورت کی طرف مغرب اور مشرق کے سوچنے والوں کو متوجہ اور متنبہ کیا تھا کہ:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

سینڈی ہک اسکول کے معصوم بچوں کو وحشیانہ دہشت گردی کا نشانہ بنانے والا نوجوان ایک متمول گھرانے کا فرد تھا جس نے پہلے اپنی ماں کے خودکار ہتھیاروں سے خود اس کو قتل کیا، اور پھر ننھے بچوں کے اس اسکول میں اس طرح گولیوں کی بارش کی کہ ایک ایک بچے کے جسم میں آٹھ سے دس گولیاں پیوست کر دیں۔ ۲۶؍افراد کا خون بہا کر اس نے خود اپنے کو بھی مار لیا اور پولیس کے آنے سے پہلے ہی ایک قیامت صغریٰ برپا کر کے اس خونیں کہانی کے باب کو مکمل کر دیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق جس بنگلے میں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا، وہ ڈھائی لاکھ ڈالر کی مالیت کا تھا اور زندگی کی ہر سہولت اس کو حاصل تھی۔ اس کی ماں کو اسلحہ جمع کرنے کا شوق تھا اور اس کے اسلحہ خانے سے اس کا یہ چشم و چراغ ایک خودکار رائفل، دو پستول اور سو سے زیادہ گولیاں لے کر اس خونیں کھیل پر نکلا تھا۔ یہ دہشت گردی بظاہر کسی ذاتی رنجش کا نتیجہ نہ تھی۔ امریکی صدر، پالیسی سازوں، دانش وروں اور میڈیا سے لے کر عام افراد ششدر ہیں اور سوال کر رہے ہیں کہ اس نوجوان نے یہ اقدام کیوں کیا؟ بحث کا محور دو نکات بنے ہوئے ہیں: ۱- امریکی معاشرے میں اسلحے کی ریل پیل، اور ۲- مرد وزن کا ذہنی انتشار جو کج روی کی طرف لے جائے۔

امریکی معاشرے میں اسلحے کی فراوانی اس دہشت گردی کا سب سے اہم سبب قرار دیا جارہا ہے۔ اسلحہ ساز کمپنیوں اور اسلحہ کے شوقین افراد کی بااثر تنظیم نیشنل رائفل ایسوسی ایشن کا کردار بھی بڑا مرکزی ہے جو ہر شہری کے اسلحہ رکھنے اور اسے آزادانہ لے کر گھومنے کے حق کو آزادیِ رائے (دستوری ترمیم نمبرا) کی طرح ایک بنیادی حق قرار دیتی ہے۔ یہ یہودی لابی کی طرح کی ایک مضبوط لابی کا کردار ادا کرتی ہے جس کے اثر کو دو ڈھائی سو سال میں بھی کم نہیں کیا جاسکا، حتیٰ کہ سپریم کورٹ نے بھی دو بار ہر شہری کے اسلحہ رکھنے کے اس حق کو تسلیم کیا ہے اور اس پر ہر پابندی کا راستہ روکا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ ۳۲ کروڑ آبادی والے امریکا میں ۳۰ کروڑ کی تعداد میں مہلک ترین اسلحہ عام لوگوں کے پاس موجود ہے، اور تحقیقی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق آبادی کے ہر ۱۰۰؍افراد میں سے ۸۹ کے پاس اسلحہ موجود ہے۔ یوں امریکا دنیا کا سب سے زیادہ مہلک ہتھیاروں سے بھرا پڑا (weaponized) ملک ہے۔ چونکہ ایسے گھرانے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جن میں کئی کئی ہتھیار ہیں، اس لیے یہ بات کہی جارہی ہے کہ عملاً آبادی کے ۴۰ فی صد

گھرانے پوری طرح مسلح ہیں اور امریکا کی ۵۰ میں سے ۴۷ ریاستوں میں اسلحہ لے کر کھلے عام پھرنے کی آزادی بھی ہے۔ رائفل، بندوق اور پستول کے استعمال سے سال میں اوسطاً ایک لاکھ افراد زخمی ہوتے ہیں اور نجی دائرے میں استعمال ہونے والے اسلحے کے ذریعے مرنے والوں کی تعداد اوسطاً سالانہ ۱۲ہزار سے زیادہ ہے۔ گویا نائن الیون میں جتنے افراد ہلاک ہوئے ان سے چار گنا زیادہ ہر سال امریکا میں عام انسانوں کے درمیان اسلحے کے استعمال سے ہلاک ہوتے ہیں۔ اور اگر اس تعداد کا موازنہ افغانستان میں امریکی اور ناٹو افواج کی ہلاکتوں سے کیا جائے تو ۱۲سال میں مارے جانے والے فوجیوں سے بھی یہ سالانہ اوسط چار گنا زیادہ ہے۔ نیز ترقی یافتہ ممالک میں اسلحے سے ہلاک ہونے والوں کا جو اوسط ہے، امریکا میں یہ شرح اس سے ۱۵ گنا زیادہ ہے۔ امریکا کے ایک تحقیقی ادارے Brady Campaign To Prevent Gun Violence کے مطابق اسلحے کے آزادانہ استعمال سے صرف اِکّا دکّا افراد ہی کو لقمۂ اجل نہیں بنایا جاتا بلکہ بیک وقت متعدد افراد کو بھی نشانہ بنایا جاتا ہے جسے multiple victim shooting اور mass-killing کہا جاتا ہے اور اس کی بہتات کا بھی یہ عالم ہے کہ ایسے اجتماعی قتل ہر ۹ء۵ دن میں ایک بار وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔

روزنامہ دی گارڈین نے نیوٹاؤن کے اس سکول میں کھیلی جانے والی خونیں ہولی پر اپنے اداریے میں تبصرہ کرتے ہوئے امریکا کے اسلحے کے بارے میں رویے اور اس کے آزادانہ استعمال کے ذکر کو اس ملک کی پہلی خصوصیّت قرار دیا ہے اور اجتماعی قتل و غارت گری کی اس روایت کا اس طرح ذکر کیا ہے:

> درحقیقت جن تین باتوں میں امریکا واقعی مختلف ہے ان میں سے ایک گولی مارنے کی بڑھتی ہوئی لہر ہے۔ جمعہ کے دن ریاست کینیکٹی کٹ کے شہر نیوٹاؤن میں بڑے پیمانے پر گولی چلانے کے واقعے میں ۲۷؍افراد ہلاک ہوگئے جن میں ۲۰ کم عمر بچے تھے۔ اس سے کچھ ہی پہلے کولوریڈو کے سینما میں جو گولی چلائی گئی تھی، ۱۲ زندگیاں اس کی نذر ہوگئی تھیں۔ لیکن یہ سال اس طرح کے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ امریکا کی بہت سی ریاستوں میں اس طرح کے واقعات ہوئے ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں جارجیا، اوہائیو، پٹس برگ،

اوک لینڈ، اوکلوہاما، سی ایٹل، وسکنسن، میناپولس اور ٹیکساس میں بڑے پیمانے پر ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ نیوٹاؤن کے واقعے سے صرف تین دن پہلے ایک نوجوان نے امریکا کے ایک شاپنگ سنٹر میں اندھادھند گولی چلائی جس میں خود کو مارنے سے پہلے دو افراد کو قتل کر دیا۔ امریکی تاریخ کے گولی مارنے کے سب سے زیادہ مہلک ۱۲ واقعات میں سے چھے جن میں بڑے پیمانے پر لوگ مارے گئے، گذشتہ پانچ برسوں میں رُونما ہوئے۔(Americans and Gun: The Shots Heard Round the World دی گارڈین، ۱۶ دسمبر ۲۰۱۲ء)

آزادیِ رامے کی حدود

اس پس منظر میں نیوٹاؤن کے اسکول میں کی جانے والی ہلاکتوں نے ملک کو ہلا دیا ہے اور اسلحے کی فراہمی (جو اس وقت اسلحے کی دکانوں کے علاوہ اسپورٹس کی دکانوں، حتیٰ کہ سپرمارکیٹوں تک میں بہ آسانی مل جاتا ہے) کو کسی ضابطے میں لانے کے لیے قانون سازی کی ضرورت پر بحث کا آغاز ہوگیا ہے۔ اسلحے کی لابی کی مزاحمت کے باوجود راے عامہ اور پارلیمنٹ کے مؤثر افراد اب اس سارے کاروبار کو قانون کی گرفت میں لانے کے بارے میں کم از کم سوچ بچار اور بحث و مباحثہ پر آمادگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بڑی اہم اور دُوررس نتائج کی بحث کا آغاز ہوگیا ہے، یعنی اس امر کو متعین کیا جائے کہ اسلحہ رکھنا ایک بنیادی حق ہے یا محض ایک سہولت، استحقاق اور ضرورت۔ نیز اس سلسلے میں اب یہ بنیادی بحث بھی ہو رہی ہے کہ دستور کے دیے ہوئے ایک حق پر قانون اور مفاد عامہ کی روشنی میں پابندی لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ آزادی راے کا حق جو دستور کی پہلی ترمیم کے ذریعے حاصل ہوا تھا، اس کے بارے میں بھی یہی بحث ہوتی رہی ہے اور اس بگ ٹٹ آزادی کا سہارا لے کر توہین رسالتؐ اور دین و مذہب کا تمسخر اُڑانے کی جسارت بھی کھلے عام کی جاتی رہی ہے۔ اس کا مسلسل اندھا دفاع کیا گیا ہے حالانکہ کچھ مقدس گائیں (Holy Cows) ہیں جن پر بات کرنا ممنوع بلکہ 'جرم' ہے، جیسے یہودیت، اسرائیل، ہالوکاسٹ اور سامیت مخالف (Anti Semitism)۔ لیکن یہی وہ عناصر جو اسلام، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دینی شخصیات کے بارے میں دریدہ دہنی اور تضحیک و تحقیر کو آزادیِ راے کا حصہ قرار دیتے ہیں، اب یہ

کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ ایک دستوری حق کے استعمال کے لیے ذمہ داری کا مظاہرہ بھی ضروری ہے۔ نیز ایک انفرادی حق کو اجتماعی مصالح سے مشروط اور محدود کیا جاسکتا ہے، اور کیا جانا چاہیے۔ نیویارک ٹائمز کا اداریہ اس سلسلے میں بڑا دل چسپ ہے:

> گولی چلانے کے سابقہ واقعات کی طرح نیوٹاؤن میں گذشتہ جمعہ کو ۲۰ بچوں اور سات بالغوں کے قتل نے امریکا میں آتشیں اسلحے کے بارے میں قومی دُھن (fixation) کو ایک بار پھر بیدار کر دیا ہے۔ اسلحے کی فی کس موجودگی کے لحاظ سے کوئی بھی ملک امریکا سے آگے نہیں ہے۔ ۳۰۰ ملین آتشیں ہتھیار عوام الناس کے پاس موجود ہیں۔ گویا کہ ہر بالغ فرد کے لیے ایک ہتھیار دستیاب ہے۔ ہارورڈ اسکول آف پبلک ہیلتھ کے ماہرین نے ۲۶ ترقی یافتہ ممالک کے اعداد وشمار کی بنیاد پر یہ بتایا ہے کہ جہاں زیادہ اسلحہ ہوتا ہے وہیں زیادہ قتل ہوتے ہیں۔ امریکا کی صورت اور بھی زیادہ تشویش ناک ہے۔ امریکا میں قتل کی شرح دوسرے خوش حال ممالک کی شرح کے مقابلے میں، جن کے ہاں اسلحے کی نجی ملکیت کو کنٹرول کرنے کے سخت قوانین موجود ہیں، ۱۵ گنا زیادہ ہے۔

اداریے میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے کے خونیں واقعات کے موقع پر بھی صدر اوباما نے اسلحے کی ملکیت اور انھیں کھلے بندوں لیے پھرنے پر قانونی گرفت بڑھانے کے اعلانات کیے ہیں لیکن عملاً کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی۔ اس اداریے میں ایک سابق رکن کانگریس جوے اسکاربروکی کے قلب ماہیت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کڑوی گولی نگلنے کا اعلان کیا ہے:

> وہ لوگ جو ہماری طرح یقین رکھتے ہیں کہ دوسری ترمیم امریکی شہریوں کو اسلحہ رکھنے کا مطلق اختیار نہیں دیتی، ان کو یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ان کا یہ موقف ہمدردی سے ان کی بات سننے والوں کو ان سے دُور کر دے گا اور اس نقطۂ نظر کے کسی وقت رائج ہونے کا جلدی امکان نہیں۔ ہمیں قانون کے پابند اور تحفظ کی ضرورت محسوس کرنے والے اسلحے کے مالکوں کی جائز تشویش کا احترام کرنا چاہیے، تاکہ لچک نہ رکھنے والے نظریاتی لوگوں کے ساتھ کوئی مشترک دائرہ تلاش کیا جاسکے۔ اسکاربرو نے اسلحے پر پابندی کے مخالفوں کے لیے چیلنج بہت اچھی طرح پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے اسلحے کی بحث میں

اپنا نقطۂ نظر تبدیل کرلیا ہے۔ اب وہ اسے حکومتی کنٹرول کے مقابلے میں فرد کے حقوق کے بجاے اسے عوام کے تحفظ کے مسئلے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک کے بعد ایک راے شماری نے یہ ظاہر کیا ہے کہ رائفل ایسوسی ایشن کے ممبران خود بھی ایسے اقدامات کے مخالف نہیں ہیں جن سے اسلحہ خریدنے اور بیچنے والے ان افراد کی جو مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے ہوں، نگرانی کی جاسکے۔ دستور نے کوئی ایسے مطلق حقوق نہیں دیے ہیں کہ ان کی خاطر عوام کے تحفظ اور بہبود کے متعلّق تشویش کو نظرانداز کر دیا جائے۔ (انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون، ۱۹دسمبر ۲۰۱۲ء)

توقع ہے کہ جس طرح اسلحے کے حصول اور اس کی کسی نمایش (display) کی آزادی کے بارے میں اجتماعی مصالح اور انسانی معاشرے کی فلاح اور امن و آشتی کی ضمانت کے لیے ایک بظاہر مطلق حق (absolute right) کو قانون اور اخلاق کے ضابطہ کار کا پابند کرنے کی بات کی جارہی ہے، اسی طرح آزادیِ راے کے تحفظ کے ساتھ اس آزادی کے غیر ذمہ دارانہ استعمال کو بھی کسی ضابطے کا پابند کرنے کا صحت مند راستہ اختیار کرنے پر غور و مباحثے کا آغاز کیا جائے گا۔

نفسیاتی امراض اور تشدد

دوسرا پہلو جس پر کھل کر بات کی جارہی ہے وہ اسلحے کا استعمال کرنے والوں، خاص طور پر وہ افراد جو قتل عام کے مرتکب ہورہے ہیں، ان کی ذہنی کیفیت اور اس کیفیت کو پیدا کرنے والے عوامل کا ادراک ہے جو ایسے مخبوط الحواس (deranged) رویے کا باعث بن رہے ہیں۔ اس سلسلے میں عمومی صحتِ ذہنی (mental health) کے مسائل اور معاشرے میں صحت کی دیکھ بھال (health care) اور خصوصیت سے نفسیاتی مریضوں کی دیکھ بھال کی کمی پر توجہ مرکوز کرائی جارہی ہے۔ مائیک راجر نے (جو ایف بی آئی کا ایک سابق افسر اور اب ایوانِ نمایندگان کا رکن ہے) کہا ہے کہ اس وقت ہماری اصل ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ ان لوگوں تک اسلحے کی رسائی کو روکیں جو ذہنی امراض کا شکار ہیں۔ ایک اور مشہور کالم نگار ٹموتھی اسٹینلے نے امریکا میں (جسے آزادی اور دولت کی جنت کہا جاتا ہے) ذہنی امراض کی کثرت اور اس کے مناسب علاج کے باب میں کوتاہی کو حالات کی خرابی کا سبب قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں:

ذہنی صحت کے اداروں کے لیے کم وسائل کی فراہمی ہی ذہنی امراض کی خطرناک کثرت کا سبب ہے، خواہ وسائل کی فراہمی میں یہ غفلت غیرارادی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی طرف ضرور توجہ کرنا چاہیے۔(دی گارڈین، ۱۸ دسمبر ۲۰۱۲ء، After the Newtown Shooting It is Time to Talk about Mental Health (and Crime

اس سلسلے میں کانگرس سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ:

براہِ مہربانی صحت کے بہتر قوانین ترتیب دیجیے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ٹک ٹک کرتے کسی بھی وقت پھٹ جانے والے بم کو غیرمؤثر کیا جاسکے اس سے قبل کہ بہت تاخیر ہو جائے۔ ایک خاندان کے لیے اس بات کو زیادہ آسان بنادیا جائے کہ ممکنہ خطرے کے حامل افراد کا لازمی علاج کروایا جاسکے۔

واضح رہے کہ امریکا کی آبادی کا تقریباً ۵۰ فی صد صحت کی سہولت سے محروم ہے اور صدر اوباما کے سارے وعدوں اور دعوؤں کے باوجود اس سمت میں پیش رفت بے حد سُست ہے، بلکہ امریکا کے ایک بڑے علاقے میں اس کی مزاحمت ہو رہی ہے۔

مغربی معاشرے کی اصل خرابی

جہاں تک امریکی آبادی اور خصوصیّت سے نوجوانوں میں پائے جانے والے نفسیاتی امراض، جذباتی ہیجان اور تشدد کے رجحان کا تعلّق ہے وہ ایک حقیقت ہے اور ٹائم بم کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیوٹاؤن اسکول کے واقعے کے بعد اس مسئلے کی طرف توجہ وقت کی ایک ضرورت ہے لیکن مسئلہ صرف افراد کی ایک بڑی تعداد کی نفسیاتی الجھنوں کا نہیں، اس سے کہیں زیادہ بنیادی ہے اور اس کا تعلّق مادیت پرستی اور یک رُخی انفرادیت پر مبنی معاشرے سے ہے جو ذہنی امراض اور معاشرتی انتشار کا اصل سبب ہے۔ جس معاشرے اور تہذیب میں اخلاق اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تعلّق کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت منقطع کر دیا گیا ہو، جہاں خاندان کا نظام درہم برہم ہو، جہاں تعلیم کو تربیت اور سیرت سازی سے بے تعلّق کر دیا گیا ہو، جہاں نفس کی پرستش زندگی کا محور ہو، جہاں خیر و شر کے ابدی پیمانے توڑ دیے گئے ہوں اور لذت اور ذاتی مفاد ساری تگ و دو کا محور ہوں

وہاں انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں بگاڑ اور معاشرے میں فساد کا رُونما ہونا ایک فطری امر ہے۔ معاملہ محض طبی سہولتوں کی فراہمی اور نفسیاتی علاج کی فکر کرنے کا نہیں (یہ تو ہونا ہی چاہیے)، اصل مسئلہ فرد کے تصورِ حیات اور معاشرے کی اجتماعی اخلاقیات کا ہے جہاں تعلیم، کھیل، میڈیا، فلم، تفریح، ہر میدان میں لذت پرستی اور نفسانفسی عام ہو، اور ہر چیز کو روندتے ہوئے اپنے مفادات کے حصول کے لیے جدوجہد انسان کی معراج قرار پائے، وہاں انسانیت کی پامالی اور معاشرے میں تصادم اور تشدد کی فراوانی سے کیسے بچا جاسکتا ہے۔

اقبال کو اس تہذیبی فساد کا پورا احساس تھا اور اس نے بہت پہلے تمام انسانوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ مادی تہذیب کا فطری ثمرہ کیا ہوگا:

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہُنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظُلمات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جُوا ہے — سُود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و اِفلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

نیوٹاؤن سکول کا واقعہ محض ایک منفرد واقعہ نہیں، امریکی اور مغربی معاشرے اور تہذیب کی اصل کیفیت کی عکاسی کرنے والا ایک آئینہ ہے۔ اہلِ نظر کا ایک گروہ پورے دُکھ اور کرب کے ساتھ نہ صرف اس واقعے پر آنسو بہا رہا ہے بلکہ اصل خرابی اور بگاڑ کی جڑ کی طرف بھی متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ابھی یہ آواز بظاہر صدا بہ صحرا ہی معلوم ہوتی ہے لیکن کم از کم یہ آوازیں اُٹھنا تو شروع ہوگئی ہیں۔

یونی ورسٹی کالج کا استاد مائیک کنگ بڑے درد بھرے انداز میں لکھتا ہے کہ:

امریکی کلچر ایک پُرتشدد کلچر ہے۔ یہ ہمیشہ سے ایک پُرتشدد کلچر چلا آرہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس 'کیوں' کے جواب میں جزوی وضاحتوں کا ایک مجموعہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ مَیں اسلحے پر کنٹرول اور ذہنی صحت پر آیندہ سطور میں بات کروں گا، لیکن یہ لوگ تشدد کے کلچر میں جس طرح ہمہ تن ڈوبے ہوئے ہیں، اس پر سنجیدہ بحث سے ہمیشہ پہلوتہی کی

جاتی ہے۔ ایک بیمار معاشرہ بیمار افراد پیدا کرتا ہے۔ جس معاشرے میں تشدد کی بہت سی قسموں کو بہادری کا نمونہ بنا کر پیش کیا جاتا ہو، اس میں تشدد کے ایسے بہت سے مظاہرے سامنے آئیں گے، جو تشدد کی تعریف میں نہیں آتے۔ اس سے قاتل کے افعال کی توجیہہ نہیں ہوتی، نہ اس کے ارادے کے لیے عقلی بنیاد تلاش کی جاتی ہے، لیکن ان عناصر کا ایک دیانت دارانہ جائزہ یہ واضح کر دیتا ہے کہ ان کے نتیجے میں ایسے رویے پیدا ہوکر رہتے ہیں اور انھیں قانون سازی یا محض مسلسل 'علاج' کے ذریعے دبایا نہیں جاسکتا...... اگر ہم یہ کر رہے ہوں، اور اس کے باوجود اس طرح کے سانحات برابر ہوتے رہیں، تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے وہ سب کچھ کیا جو کر سکتے تھے؟ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ایک ایسے مسئلے کو حل کرنا مشکل ہے جس کے اسباب تک بیش تر لوگ نہیں پہنچ پاتے۔ لیکن مزید قانون سازی، نگرانی، علاج معالجہ اور مجرم قرار دینے سے نامناسب ضمنی اثرات پیدا ہوتے ہیں اور مسئلے کی صحیح تشخیص بھی نہیں ہوتی، اور نہ صورتِ حال کو درست کرنے کے لیے ہی جو کچھ ضروری ہے اس کے لیے سنجیدگی سے اندازہ لگایا جاتا ہے۔

جس طرح کسی مرض کے لیے کھائی جانے والی دواؤں کے ضمنی اثرات کو دُور کرنے کے لیے دوسری دوائیں دی جاتی ہیں، اسی طرح اسلحے پر کنٹرول اور علاج کے مطالبے علامات میں چھپی بیماری کی تشخیص میں ناکام ہیں۔ ہمارا ایک صحت مند حقیقی معنوں میں مستحکم اور منصفانہ معاشرے کا تصور کرنا اور اس کے لیے لڑنے کی اہلیّت نہ رکھنا، اور ہمارا (knee jerk) جیسے ردعمل کی طرح حکومت سے مسئلہ حل کرنے کی توقع رکھنا، جیسے کہ کوئی سادہ حل موجود ہو، جیسے حکومت بجاے استحصال کرنے کے اس کو حل کرنا چاہے، جیسے کہ وہ اتنی صلاحیت رکھتی ہو کہ اسے حل کرے اور وہ اس کا حل رکھتی بھی ہو، (ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ) اس وقت تک قتل و غارت جاری رہے گی، جب تک کہ ہم اپنے نیک ارادوں کے ذریعے ریاست کی حمایت کردہ قتل و غارت برپا کرتے رہیں گے۔ (Misdiagnosing the Culture of Violence، کاؤنٹر پنچ، ۱۸دسمبر۲۰۱۲ء)

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مسئلہ محض اسلحے کے حصول اور اس کی نمایش کی آزادی

کی تحدید اور ذہنی امراض کے علاج معالجے تک محدود نہیں۔ بگاڑ کے اسباب گہرے ہیں جن کا تعلّق اصلاً عقیدہ، تصورِ حیات، محرکاتِ عمل اور کامیاب اور ناکام زندگی کے تصورات سے متعلّق ہے اور اصلاحِ احوال کے لیے جو بھی حکمت عملی وضع کی جائے، وہ اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب اس میں ان تمام پہلوؤں کا خاطرخواہ لحاظ کیا گیا ہو۔ اصلاحِ احوال اسی وقت ممکن ہے جب اصل اسباب کا ادراک ہو اور ان اسباب کو دُور کرنے کے لیے حقیقت پسندانہ انداز میں ایک ہمہ گیر تبدیلی کا راستہ اختیار کیا جائے۔

پھر مسئلہ محض امریکا میں داخلی طور پر جان، مال اور آبرو کی بے توقیری تک محدود نہیں، عالمی سطح پر احترامِ انسانیت اور عدل و انصاف کے باب میں امریکا اور مغربی اقوام، جو آج کی کارفرما قوتیں ہیں، ان کا کردار بھی ہے۔ جو مثال وہ خود دنیا کے سامنے قائم کر رہی ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں خود اُن کی سرزمین پر ان کے حکمران قوتوں کے اپنے ہی سپوت اگر قتل و غارت گری اور دہشت گردی کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں، تو اس عالمی کردار کی موجودگی میں امریکا میں محض جھنڈے پست کرنے اور سوگ منانے سے حالات تبدیل نہیں ہوسکتے۔ اور پھر معاملہ محض امریکا اور مغربی اقوام کا نہیں، دنیا کے بیش تر ممالک میں ان کی اپنی حکومتوں اور برسرِ اقتدار قوتوں کے رویے کا بھی ہے۔ اگرچہ خود پاکستان کی سرزمین پر روز و شب خون خرابا ہو رہا ہے اور جس طرح سرکاری اور غیرسرکاری سطح پر تشدد اور دہشت گردی میں اضافہ ہو رہا ہے، وہ بھی اس سے غیر متعلّق نہیں، بلکہ اس عالمی منظرنامے کا ایک حصّہ ہے۔ ہر معصوم انسان کا خون پوری انسانیت کا خون ہے اور ہر بچے اور بوڑھے اور مرد و زن پر جو گزر رہی ہے وہ ہم سب کا مشترک المیہ ہے۔ ہم پاکستان میں نیوٹاؤن کے معصوم بچوں اور اساتذہ کی ہلاکت پر خون کے آنسو رو رہے ہیں لیکن خود ہمارے ملک کے گوشے گوشے میں خصوصیّت سے پشاور، شمالی علاقہ جات، کوئٹہ، بلوچستان اور کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے صرفِ نظر کیسے کر سکتے ہیں اور اس کا جو تعلّق امریکا کی عالمی دہشت کے نام پر جنگ سے ہے، اس کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ سب کچھ عالمی دہشت گردی کے ایک منصوبے کا حصّہ ہے۔ اس وقت جب ہم نیوٹاؤن سکول کے ۲۰ بچوں کا نوحہ کر رہے ہیں، کیا ہم ان ۳۵ بچوں کو بھول سکتے ہیں جو اسی سال

نومبر میں صرف چند دن پہلے اسرائیل کی بم باری سے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے؟ کیا ہم ان ۱۶۸ بچوں کو بھول سکتے ہیں جن کی امریکا کے ڈرون حملوں سے پاکستان میں ہلاکت کا اعتراف امریکی جامعات کر رہی ہیں؟ گو ہماری اطلاعات کے مطابق شہید ہونے والے معصوم بچوں، عورتوں اور عام شہریوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اور کیا ان ۲۳۱ بچوں کو بھلایا جاسکتا ہے جو خود افغانستان میں اسی سال صرف چھے ماہ میں شہید کیے گئے ہیں؟ اور کیا ان ۹۲۱ بچوں کی ہلاکت کو بھی بھلایا جاسکتا ہے جو سرکاری اعداد و شمار کے مطابق امریکا کے حیوانی حملوں سے عراق میں شہید کیے گئے۔ یہ سب تو صرف اس سال کی خونیں داستان ہے۔ کینوس کو ذرا وسیع کیا جائے تو کیا ان ۶ لاکھ بچوں کو بھلایا جاسکتا ہے جو عراق میں امریکی پابندیوں کے نتیجے میں ۱۹۹۰ء کے بعد سے اب تک جان کی بازی ہار گئے ہیں اور جن کی موت کو امریکا کی ایک سابق سیکرٹری خارجہ میڈلین آل برائٹ نے جنگ کی ناگزیر قیمت (inevitable cost of war) قرار دے کر چٹکیوں میں اڑا دیا تھا۔[1]

امریکا کی دہشت گردی اور مغرب کے باضمیر دانش ور

عالمی میڈیا اور دانش وروں کے ایک گروہ نے جس طرح امریکی اسکول کے بچوں کا سوگ منانے کے ساتھ دہشت گردی کے واقعات کو روکنے کی حکمت عملی کو محض عسکری حکمت عملی تک محدود نہ رکھنے اور ایک ہمہ جہتی حکمت عملی بنانے کی ضرورت کا اظہار کیا ہے، اگر وہ صرف امریکا کے لیے درست ہے، تو کیا باقی تمام دنیا کے بارے میں اس کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے؟ کیا تمام دنیا سے دہشت گردی کے خاتمے اور خاص طور سے ان ممالک کو دہشت گردی کی آگ سے نکالنے کے لیے بھی ایک ہمہ جہتی اور حقیقت پر مبنی حکمت عملی کی ضرورت نہیں جن کو خود امریکا کی مسلط کردہ 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کی وجہ سے ان انسان کش اور تباہ کن حالات میں دھکیل دیا گیا ہے۔ کیا شرفِ انسانیت صرف امریکی بچوں کے لیے خاص ہے اور پاکستانی، کشمیری، فلسطینی، یمنی،

۱- ہلاک ہونے والے بچوں کی تعداد تو اس سے کہیں زیادہ ہے لیکن ہم نے یہاں مثال کے لیے صرف وہ اعداد و شمار دیے ہیں جو مغرب کے معتبر اداروں نے دیے ہیں۔ ملاحظہ ہو: بل کیونگلے (پروفیسر آف لا، لائے لوٹا یونی ورسٹی، نیو آرینز، یو ایس اے)، Remeber All the Childrens, Mr. President، کاؤنٹر پنچ، ۱۷ دسمبر ۲۰۱۲ء)

افغانی بچے اس شرف سے محروم ہیں اور وہ صرف استعماری قوتوں کے لیے خس و خاشاک کی مانند ہیں اور ان کے استعماری کھیل کے لیے صرف توپ کے چارے (canon-fodder) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ہم نیوٹاؤن کے معصوم بچوں کا نوحہ کر رہے ہیں تو دوسرے بچوں کو کیسے بھول سکتے ہیں؟ اور اگر ہمارے ممالک کی قیادتیں خود اپنے بچوں کی ہلاکت پر بے چین نہیں ہوتیں اور ان پھول سی ہستیوں کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں نہیں مارتیں تو کیا ان کو اس قوم کا وفادار سمجھا جاسکتا ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے جس پر سب سے پہلے پاکستان کے عوام اور اُمت مسلمہ اور خاص طور سے اس کی قیادتوں کو غور کرنا چاہیے اور اس باب میں عوام کو اپنی اپنی قیادت کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ دیکھیے، خود عالمی برادری کی کچھ حساس روحیں اس تضاد کو کس طرح محسوس کر رہی ہیں اور انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کاش یہ آواز مغرب سے پہلے خود مشرق سے اُٹھتی اور عالمِ اسلام، عرب دنیا اور پاکستان کی قوم، پارلیمنٹ اور قیادتیں اس آواز کو اُٹھاتیں اور اپنے عوام کے حقوق کے لیے عملی اقدام کرتیں۔ ہم صرف چند اہلِ دل کے کرب کی کچھ جھلکیاں اپنی قوم اور اس کی قیادت کو شرم دلانے کے لیے پیش کرتے ہیں:

برطانیہ کے مشہور دانش ور اور دی گارڈین کے مضمون نگار جارج مون بیوٹ بڑے درد بھرے انداز میں اپنے مضمون میں امریکا اور مغربی اقوام کے دوغلے پن اور تضادات کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ مضمون کا عنوان ہی مغرب کی تہذیبی اور سیاسی قیادت پر ایک چارج شیٹ کی حیثیت رکھتا ہے: In the US, Mass Child Killings are Tragedies, In Pakistan, Mere Bug Splats. (امریکا میں بچوں کے قتل عام ایسے ہیں، پاکستان میں محض مچھر مکھی مارنا)۔

وہ صدر اوباما کے ان الفاظ کو اپنے مضمون کا مرکزی خیال بناتا ہے جو موصوف نے نیوٹاؤن سکول کے بچوں کے سفاکانہ قتل پر چشم پُرنم کے ساتھ ادا کیے تھے، یعنی:

> محض الفاظ تمھارے غم کا کوئی مداوا نہیں، نہ وہ تمھارے دلوں کے زخم بھر سکتے ہیں...... ایسے المیے ختم ہونے چاہییں، اور انھیں ختم کرنے کے لیے ہمیں لازماً تبدیل ہونا چاہیے۔

پھر وہ یہ چبھتا ہوا سوال اُٹھاتا ہے کہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکا میں ایک پاگل نوجوان کے بچوں کو قتل کرنے پر جس چیز کا اطلاق ہوتا ہے، اسی طرح اس کا اطلاق پاکستان میں ان بچوں کے قتل پر بھی ہوتا ہے، جو ایک اداس امریکن صدر کر رہا ہے۔ یہ بچے اتنے ہی اہم، اتنے ہی حقیقی، اور دنیا کی توجہ کا اتنا ہی استحقاق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے نہ صدارتی تقاریر ہیں، نہ صدارتی آنسو، نہ عالمی اخباروں کے صفحۂ اوّل پر ان کی تصاویر، نہ ان کے غم زدہ رشتے داروں کے انٹرویو، نہ اس کا باریک بینی سے تجزیہ ہے کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا؟

اگر اوباما کے ڈرون حملوں سے مرنے والوں کا ریاست کی طرف سے ذکر کیا جاتا ہے تو اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ جیسے انسانوں سے کم درجے کی چیز ہوں۔ وہ لوگ جو ڈرون کے پورے عمل کو چلاتے ہیں، رولنگ سٹون میگزین کی رپورٹ کے مطابق اِن ہلاک شدگان کا تذکرہ یوں کرتے ہیں گویا محض مچھر مکھی مارنا ہو۔ اس لیے کہ ایک سبز دھندلے وڈیو پر ان کے جسم کا عکس یہ تاثر دیتا ہے کہ کیڑا کچلا گیا ہے، یا ان کی اتنی وقعت ہے کہ جیسے بس ایک خس و خاشاک ہوں۔ ڈرون جنگ کا دفاع کرتے ہوئے اوباما کے دہشت گردی کے مشیر بروس رڈل نے کہا: آپ کو لان کو ہر وقت کاٹنا پڑتا ہے۔ جیسے ہی آپ کاٹنا بند کرتے ہیں تو گھاس کا دوبارہ اُگ آنا یقینی ہے۔

عراق میں جارج بش کی حکومت کی طرح اوباما انتظامیہ بھی شمال مغربی پاکستان میں سی آئی اے کے ڈرون حملوں کے نتیجے میں شہریوں کی ہلاکتوں کو نہ تسلیم کرتی ہے، نہ اس کا ریکارڈ رکھتی ہے، لیکن اسٹین فورڈ اور نیویارک یونی ورسٹیوں کے قانون کے اسکولوں کی رپورٹ کے مطابق: اوباما کے پہلے تین برسوں میں ۲۵۹ حملے ہوئے جس کے لیے وہ ذمہ دار ہیں۔ اس میں ۲۹۷ اور ۵۶۹ کے درمیان شہری ہلاک ہوئے جن میں کم سے کم ۶۴ بچے تھے۔ یہ وہ اعداد و شمار ہیں جو قابلِ اعتماد رپورٹوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں جن کا مکمل ثبوت نہیں رکھا گیا ہے۔

علاقے کے بچوں پر اس کے دور رس اثرات تباہ کن ہیں۔ بہت سے بچے اسکولوں سے

اُٹھا لیے گئے ہیں، اس خوف سے کہ کسی بھی قسم کے بڑے مجمعوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جب سے بش نے ڈرون حملوں کا آغاز کیا تھا اسکولوں پر متعدد حملے ہوئے ہیں۔ لیکن اوباما نے اس عمل کو بہت جوش و خروش سے پھیلا دیا ہے۔ بش کی ایک فاش غلطی سے ۶۹ بچے مارے گئے۔ مطالعے میں بتایا گیا ہے کہ جب بچے ڈرون کی آواز سنتے ہیں تو وہ دہشت سے چھپنے لگتے ہیں۔ ایک مقامی ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ ان کا خوف اور جو ہولناک مناظر وہ دیکھتے ہیں اس سے ان کے دماغ کو مسلسل نقصان پہنچ رہا ہے۔ ڈرون حملوں میں زخمی ہونے والے بچوں نے تحقیق کاروں کو بتایا کہ وہ اتنے زیادہ خوف زدہ ہیں کہ سکول نہیں جا سکتے، اور انھوں نے اپنے مستقبل کی ساری اُمیدوں کو ختم کر دیا ہے۔ ان کے جسم ہی نہیں ان کے خواب بھی بکھر گئے ہیں۔

کہنے کو اوباما بچوں کو جان بوجھ کر قتل نہیں کرتا لیکن اُس کے حکم پر جس طرح سے ڈرون حملے کیے جاتے ہیں، ان کی ہلاکت اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان اموات کے اس پر کیا جذباتی اثرات ہوتے ہیں، اس لیے کہ نہ وہ، نہ اس کے افسر اس کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ پاکستان میں سی آئی اے کے ذریعے ماوراے عدالت قتل سے متعلق تقریباً ہر چیز خفیہ رکھی جاتی ہے، لیکن آپ کو تاثر یہ ملتا ہے کہ جیسے انتظامیہ کے کسی فرد کی نیند تک خراب نہیں ہوئی۔

افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ ان پاکستانی بچوں کے غم میں اور اس خونِ ناحق کی فراوانی پر امریکی قیادت اور ڈرون برسانے والوں کی نیندیں تو اُچاٹ نہ ہوئیں، لیکن کیا پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت بھی کسی کرب میں مبتلا ہوئی اور کیا ان معصوم بچوں کی اس دردناک پکار بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ کی کوئی کسک اپنے مجرم ضمیر میں محسوس کی؟

جارج مون بیوٹ اپنے مضمون کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے جو ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ فراہم کرتے ہیں:

عالمی میڈیا کا بیش تر حصہ جس نے نیوٹاؤن کے بچوں کو بجا طور پر یاد رکھا ہے لیکن اوباما نے جو قتل کیے ہیں ان کو نظرانداز کرتا ہے یا سرکاری بیان کو درست تسلیم کرتا ہے کہ جو

مارے گئے وہ سب 'جنگ جُو' تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمال مغربی پاکستان کے بچے ہمارے بچوں کی طرح نہیں ہیں۔ ان کا کوئی نام نہیں ہے، نہ ان کی یاد میں شمعیں روشن کی جاتی ہیں، نہ پھول ہیں اور نہ ٹیڈی بیئر کی یادگاریں۔ جیسے کہ وہ کسی غیرانسانی دنیا کے کیڑے مکوڑے اور گھاس پھوس کی طرح ہوں۔ اوباما نے اتوار کو کہا: کیا ہم یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ ہمارے بچوں کو سال بہ سال جس تشدد کا سامنا ہے وہ کسی نہ کسی طرح ہماری آزادی کی قیمت ہے؟ یہ ایک جائز سوال ہے۔ اسے اس کا اطلاق اس تشدد پر بھی کرنا چاہیے جو پاکستان کے بچوں پر وہ کر رہا ہے۔

دی گارڈین کے ایک اور کالم نگار گلین گرین ورلڈ نے اپنے مضمون New Town Kids vs Yemenis and Pakistanis: What Explains the Disparate Reaction? میں اس مسئلے کی طرف متوجہ کیا ہے:

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہی لوگ جو نیوٹاؤن میں ہلاک ہونے والے بچوں پر صدمے اور افسوس کا اظہار کر رہے ہیں، وہ اسی تشدد سے یمنی اور پاکستانی بچوں کو ہلاک کیے جانے کی کھلی حمایت تو نہیں کرتے لیکن مسلسل نظرانداز کرتے ہیں۔ یہ ستم ظریفی دیکھیے: پیر کے دن تین سال قبل صدر اوباما کے جنوبی یمن کے المجالہ قصبے پر کروز میزائل اور کلسٹر بم حملے سے ۱۴ خواتین اور ۲۱ بچے ہلاک ہوئے، یعنی اس روز نیوٹاؤن میں دیوانے نے جتنے بچے مارے اس سے ایک زیادہ۔ امریکا میں اس قتلِ عام کو اس توجہ کا ذرا سا حصّہ بھی نہیں ملا جو نیوٹاؤن کے واقعے کو ملا، اور نہ اس پر کوئی اعتراض، احتجاج یا واویلا ہوا (بس چند بڑے مسلم ممالک میں کچھ غصہ اور توجہ اس کے حصّے میں آئی)۔

اس سوال کا جواب ملنا چاہیے کہ بچوں اور دوسرے معصوموں کے قتل پر ردِعمل میں اس اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ امریکا کا میڈیا نیوٹاؤن میں قتل ہونے والے بچوں کی تفصیلات گہرائی میں جا کر آخری جزئیات سمیت مسلسل فراہم کرتا ہے لیکن جو بچے امریکا کی اپنی حکومت دوسرے علاقوں میں قتل کر رہی ہے اس سے وہ یکسر بے نیاز ہے۔

گلین گرین ورلڈ جرمن رسالے *Der Spiegel* میں امریکی ڈرون پائلٹ بران ڈون برائینٹ

کا ایک مکالمہ نقل کرتا ہے جسے پڑھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے لیکن اس سے سامراجی فوج کے خون آشام سورماؤں کا ذہن سامنے آتا ہے۔ بران نے ڈرون سے میزائل داغا اور آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا، بلڈنگ زمین بوس ہوئی اور ایک ننھا بچہ جس کی ایک جھلک دکھائی دی تھی، موت کی آغوش میں جا پہنچا۔ اس نے پاس بیٹھے ہوئے اپنے ساتھی سے پوچھا: ''کیا ہم نے ایک بچے کو ہلاک کر دیا ہے؟'' ساتھی نے جواب دیا: ''ہاں میرا خیال ہے کہ مرنے والا ایک بچہ تھا''۔ ڈرون سے میزائل چلانے والے ابھی اس فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ امریکا کی ملٹری کمانڈ سنٹر کے ایک افسر نے مداخلت کی اور کہا: No, That was a dog (نہیں، وہ ایک کتا تھا)۔ جس پر وڈیو پر اس منظر کو دیکھنے والے ایک اور سورما نے گرہ لگائی کہ A dog on two legs (دو ٹانگوں والا کتا)۔

گلین گرین والڈ اس ذہنیت اور اس کے نتیجے میں رُونما ہونے والی تباہی اور امریکا بے زاری کے طوفان کو دو اور دو چار کی طرح مغربی اقوام کی قیادت کے سامنے رکھنے کی جسارت کرتا ہے:

> مسلمانوں کے بچوں کو محض کتا سمجھنا امریکا کی جارحیت اور گذشتہ عشرے میں فوجی اقدامات میں مسلسل اضافے کے نتیجے میں انسانیت کی تذلیل کا اظہار ہے۔ ایک فوجی سلطنت کے شہری اپنے فوجیوں کی ذہنیت کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اوباما کا دفاع کرنے والے ترقی پسندوں کو سنیے جب وہ تمغے سجائے، سگار پیتے فوجیوں کی طرح کہتے ہیں کہ جنگ دوزخ ہے اور ضمنی نقصان (collateral damage) کا جواز پیش کرتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کو دشمن اور ان کو انسان نہ سمجھنے کی مہم ہے جو اپنا زہریلا سر نکال رہی ہے۔ ایک دوسرا مسئلہ بھی ردعمل کے مختلف ہونے سے سامنے آیا ہے: کس کے ذریعے ہو رہا ہے، اور کون قصوروار ہے؟ نیوٹاؤن میں گولی مارنے کے واقعے پر غم و غصّے کا اظہار آسان ہے اس لیے کہ ہم میں سے بہت کم پر اس کی ذمہ داری آتی ہے۔ گو کہ ہم ایسے اقدامات کر سکتے ہیں کہ اس کے اثرات کم ہوں اور آیندہ ایسے واقعات کا امکان کم ہو جائے۔ لیکن ہم بہت کم ایسا کر سکے کہ نفسیاتی مریضوں کو روک سکیں۔ غم و غصہ آسان ہے، اس لیے کہ ہمیں اپنے آپ کو یہ بتانا آسان ہے کہ گولی مارنے والے کا ہم سے اور ہمارے افعال سے کوئی تعلّق نہیں۔

(بقیہ ص ۱۰۵)

بلاشبہ (اللہ ہی ہے) جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمھیں ضرور بہترین انجام تک پہنچادے گا، کہہ دیجیے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی گمراہی میں ہے۔ (القصص:85) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: تم لوگوں میں سب سے اچھا وہ ہے جس نے قرآن کا علم حاصل کیا اور دوسروں تک قرآن کی تعلیمات پہنچائیں۔ ہمارا پہلا اور آخری مقصد فقط ایک ہی ہے کہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کو قرآنی تعلیمات سے آگاہ کریں تاکہ ان کو زندگی میں پیش آنے والے معاملات کا صحیح فیصلہ کرنا آجائے۔ اردو جاننے والے خوش نصیب ہیں کہ قرآن کے تقریباً پچاس فیصد الفاظ ایسے ہیں جو ہم اردو میں بھی بولتے ہیں اس لیے اردو بولنے والوں کے لیے قرآن سمجھنا زیادہ آسان ہے۔

ہماری نئی کتاب **قرآن: آسمانی منشورِ آزادی** (حصہ دوم)

صفحات:216 زرِتعاون: صرف 60 روپے

محمد سرور خان صاحب کی تحریر وترتیب کی ہوئی اس کتاب میں انسانوں اور مومنوں کے لیے براہِ راست ہدایات و احکامات جمع کیے گئے ہیں اور وہ آیات بھی ہیں جس میں کسی حکم کی حکمت یا وجہ بھی بیان کی گئی ہے مثلاً اے مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے لعلکم تتقون تاکہ تم سب تقویٰ شعار بنو۔ (البقرہ:183)

قائم شدہ 2003ء

قرآنک بک فاؤنڈیشن

www.quranicbookfoundation.org

گلوبل میگ ایجنسی، کراچی 0300-221 4657

اِسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ہیڈ آفس: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور، پاکستان

Tel: 042-35417074 E-mail:islamicpak@yahoo.com